Fikr-o-Nasar (Islamabad) 14:5 (1976)

اسلامی ریاست میں

غیر مسلموں کے حقوق

رشید احمد (جالندھری)

پیشتر اس کے کہ نفسِ مضمون کے متعلق کچھ کہا جائے مناسب ہوگا کہ دو نکات کی وضاحت کر دی جائے۔ اولاً مذاہب میں انسان کا مقام، ثانیاً مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اسلام میں انسان کے مقام کے متعلق قرآن اور احادیث دونوں میں بالتصریح یہ موجود ہے کہ انسان [illegible] الاصل ہے اور انسان کو خدا نے اپنی صورت پر بنایا ہے۔ اسے فطرت کا شاہکار بیان کرتے ہوئے قرآن پاک نے کہا ہے "ہم نے یقیناً انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا۔" ایک اور جگہ تخلیقِ آدم کے وقت خدا فرشتوں سے یوں خطاب کرتا ہے "جب میں اس کو درست کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کو سجدہ کرتے ہوئے گر پڑو۔"[1]

انسان اس لحاظ سے بہت زیادہ قیمتی ہے کہ خود خدا اس کی عزت افزائی کرتا ہے۔ اس کی عزت و توقیر کی بنا پر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ نظام باطل ہے جس سے انسان کی تذلیل ہوتی ہو یا اس کا وقار مجروح ہوتا ہو۔ اسلام کی نظر میں ہر بشر [illegible] ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر اس انسان کا احترام کرے جس سے کوئی زیادتی کی گئی ہو یا جس کی تحقیر کی گئی ہو۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور خدا کا محبوب ترین شخص وہ ہے، جو اس کی مخلوق کا سب سے زیادہ خدمت گزار ہے۔"[2] یہی وجہ ہے کہ صوفیوں نے بھی [illegible] مسلمان بالعموم اور صوفیا بالخصوص نسل، رنگ اور مذہب سے قطع نظر انسان سے محبت [illegible] سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے بوستان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے ایک مسافر کو کھانے پر مدعو کیا۔ مسافر نے خدا کا نام لئے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو بہت کوفت ہوئی انہیں یہ معلوم کر کے بہت رنج ہوا کہ ان کا مہمان آتش پرست ہے چنانچہ نہایت بے رخی سے دستر خوان سے اٹھا کر گھر سے چلتا کیا۔

بعد میں خدا نے حضرت ابراہیم کی سخت سرزنش کی اور کہا ہم تو اسے پچھلے سو سال سے اپنی ربوبیت سے بہرہ ور کر رہے ہیں اور تم نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے مہمان سے خفا ہو کر اسے باہر نکال دیا۔ ۵

اسلامی فکر میں انسان کا خاص مقام ہے لہٰذا مشیتِ ایزدی یہ ہے کہ انسان کو اپنے مبداء اور اصل کا صحیح شعور ہو اور وہ دنیا میں پر اپنے قیام کے دوران صحیح راستہ اور درست رویہ اختیار کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے تو وہ قرآن حکیم کے مطابق انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

جہاں تک دوسرے نکتے یعنی مسلمانوں کا غیر مسلموں سے معاملے کا تعلق ہے تو اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ بیشتر مغربی مستشرقین نے اس اہم موضوع پر جذبات سے مغلوب ہو کر اسلامی نقطہ نظر کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر سر ولیم میور کہتا ہے: "صدیوں تک قبائل اور عوام الناس (مسلمان) اس خیال سے اپنے آپ کو میدان جنگ میں جھونکتے رہے کہ اپنے خالق کی راہ میں جان دے کر اس کے قانون کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بحر روم سے لے کر بحیرہ قزوین تک زمین انسانی خون سے سیراب ہو گئی ہے۔ ۶"

ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ بیان اس شخص کا ہے جس نے ہند میں انگریزوں کے راج کے قیام کی خاطر ہندوستانیوں کا خون بہا لیا ہے۔ اس قسم کے پروپیگنڈے سے انسانی معاشرے میں غلط فہمیوں اور نفرت پیدا کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ قرآن اور احادیث کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات امن پر استوار ہوتے ہیں نہ کہ دشمنی اور جنگ پر۔ جنگ ایک عارضی صورت حال ہے جس کی اجازت صرف اسی صورت میں دی گئی ہے جب مسلمان جارحیت اور جور و ستم کا شکار رہیں۔ انہیں پر امن ہمسایوں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں جنگ کی اجازت نہیں دی گئی۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: "خدا کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں لیکن زیادتی کا ارتکاب مت کرو...... ان سے جنگ کرتے رہو کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف خدا کے لیے رہے۔ ۷" ان آیات کے مندرجات بالکل واضح ہیں۔ مسلمان فقہاء کی اکثریت جن میں امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام حنبل بھی شامل ہیں اس خیال کے حامی ہیں کہ جنگ کا جواز دشمن کی جارحیت ہے نہ کہ اسلام کا انکار۔ نیز جنگ کا مقصد فتنہ و ظلم کو ختم کرنا ہے۔ مزید براں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ امن پسند اور بقائے باہمی کی حامی قوموں سے جنگ نہ کرنے کا عارضی یا مستقل معاہدہ کر لیں۔ علاوہ ازیں ایک اور آیت میں بھی واضح طور پر اس امر کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کو ان لوگوں سے شفقت سے پیش آنے کو کہا گیا ہے جو ان کے خلاف مذہبی جنگ نہیں کرتے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: "اللہ اس بات سے منع نہیں کرتا کہ جو لوگ دین کے معاملے میں تم سے لڑے اور نہ تمہیں گھروں

سے نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور انصاف کرو۔ یقیناً خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے[۴۶]۔"

ان آیات پر مزید کسی تبصرے کی گنجائش نہیں ہے جو اپنی تفسیر خود ہیں۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے امن سے رہیں اور ان سے بھلائی اور تقوےٰ کے کاموں میں تعاون کریں اور گناہ اور تعدّی میں مدد نہ کریں[۴۷]۔ مسلمانوں کے لیے عملی زندگی کے لیے قرآن پاک کا یہ ایک رہبر اصول ہے۔ لہٰذا قرآن پاک کا یہ حکم کہ "غیر مسلموں سے جنگ کرو اور ان سے دوستی اختیار نہ کرو" صرف ان غیر مسلموں پر صادق آتا ہے جن سے مسلمان برسرپیکار ہوں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مذہب کا کام انسانی معاشرے میں تفریق اور نفرت پیدا کرنا ہرگز نہیں۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق

۱۔ مذہبی آزادی ۔ چونکہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے باہمی تعلقات امن پر مبنی ہیں اور مسلمانوں کو نیکی کے کاموں میں دوسروں سے تعاون کا حکم بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے یہ سمجھنا مشکل کام نہیں رہتا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق کیا ہیں۔ جس ملک میں مسلم اور غیر مسلم اپنے دنیاوی امور کے لیے ایک ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں وہاں باعزت زندگی بسر کرنے کے لیے دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ یہ درست ہے کہ اسلام مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا قائل نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام کو دوسرے مذاہب کی قیمت پر اپنی ترقی کا حق حاصل ہے یا اسے اپنی بقاء کے لیے ریاست کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس اسلام ہر شخص کے لیے حریت فکر اور آزادی رائے کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ ایمان کا ایک عقیدہ ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے مابین ایک ذاتی معاملہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے مذہب کو دوسرے پر ٹھونسے۔ لہٰذا اسلامی ریاست ان معانی میں ایک مذہبی ریاست نہیں جو مغرب کی سیاسی زبان میں اس لفظ سے مراد لیے جاتے ہیں۔ اسلام اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ مذہبی امور میں مکمل آزادی دے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی آزادی کا سوال کبھی بھی کسی اسلامی ریاست میں پیش نہیں آیا کیونکہ اسلام فتنہ کو خواہ کسی بھی شکل میں ہو، قتل سے بڑا جرم تصور کرتا ہے جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ فتنہ کو ختم کرنے کے لیے اسلام مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن کے مطابق گرجا گھر، صومعے اور مسجدیں جن میں مذہبی زندگی کی آزادی ختم ہو جاتی[۴۸]۔ قرآن پاک میں مذہبی آزادی کے متعلق متعدد احکامات کے علاوہ خود رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں اور یہودیوں سے کئی ایک معاہدے کئے جن کی رُو سے ہر ایک کو آزادی حاصل تھی۔

مدینہ میں ہجرت کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے قبائل سے جن میں یہودی بھی شامل تھے ایک میثاق کیا تھا۔ یہ تاریخی دستاویز اسلام کی تاریخ میں ایک کلیدی پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میثاق کی رُو سے:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شہری ریاست قائم کی جس کے شہری مسلمان اور یہودی تھے۔

۲۔ دونوں فریقین مدینہ پر کسی حملہ کی صورت میں اس کے دفاع کے ذمہ دار تھے۔

۳۔ دونوں جنگ کے اخراجات برداشت کرنے کے پابند تھے۔

۴۔ دونوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔

۵۔ یہودی مسلم معاشرے کا ایک حصہ تصور ہوتے تھے[۹]

اس میثاق سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اوّل یہودی اپنی عبادات اور مذہبی رسوم ادا کرنے میں آزاد تھے۔ دوم ان پر کوئی جزیہ یا دفاعی ٹیکس عائد نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ جزیہ ان پر لگایا جاتا ہے جو دفاع میں حصہ دار نہ ہوں۔ بعد میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے ایک اور معاہدہ کیا۔ ذیل میں اس معاہدہ کے چند اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

ان کی کبھی تحقیر نہیں ہوگی۔ ان کے لیے فوجی سروس لازمی نہیں ہوگی۔ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ ان کی زندگی، مال، مذہب، گرجوں اور ان کی ہر ملکیت کو چھوٹی ہو یا بڑی، مکمل حفاظت کی جائے گی[۱۰]

چونکہ فوجی سروس لازمی نہیں تھی اس لیے وہ جزیہ دینے کے پابند تھے لیکن جب عراق کے ایک عرب عیسائی قبیلہ بنو تغلب نے جزیہ کو اپنی تحقیر تصور کیا تو انھیں جزیہ کی ادائیگی سے مستثنےٰ قرار دیدیا گیا۔ اور انہیں دوسرے مسلمانوں کی طرح صدقات دینے کو کہا گیا[۱۱] دوسری طرف جب مصر کے مسلمانوں کو فوجی سروس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تو اس کے عوض ان پر جزیہ لگا دیا گیا[۱۲] اس مسئلہ نے ذرا طوالت اختیار کر لی ہے لیکن یہی مسئلہ ہے جس کو سب سے زیادہ غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اور جس پر بہت لے دے ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے مسلم اور غیر مسلم دونوں نے جزیہ کا مفہوم ٹھیک طرح نہیں سمجھا۔ کسی صورت میں بھی غیر مسلموں پر کوئی تعزیری ٹیکس نہیں تھا اور یہ کیسے ممکن تھا جب کہ اسلام واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ لہٰذا غیر مسلم اپنے مذہبی امور بجا لانے میں بالکل آزاد ہیں۔ علاوہ ازیں اسلام نے کبھی اس کام کی اجازت نہیں دی کہ مسلمان دوسرے مذاہب سے معاندانہ برتاؤ روا رکھیں۔ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آنجہانی پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں، "عربوں کے دورِ حکومت کی پہلی صدی میں عیسائیوں کے مختلف فرقوں کو ایسی

آزادی اور مسلمانوں کی خوش دلی حاصل تھی کہ بازنطینی حکومت میں پشت ہا پشت اس کی نظیر نہیں ملتی۔"[۵۸]

اب ہم ان مسائل کا جائزہ لیتے ہیں جن سے آج کل ہمارے ہندو اور عیسائی ہم وطن دوچار ہیں۔ کچھ پاکستانی عیسائیوں نے اپنی مذہبی اور تہذیبی زندگی کی بقا کے متعلق خدشات کا اظہار کیا ہے۔[۵۹] انہیں یہ خیال ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کو اپنے اعتماد میں نہیں لیتے۔ اس لیے مشترک مسائل کا بھی غیر مسلموں سے ذکر تک بھی نہیں کرتے۔[۶۰] اس گلہ کو بالکل بے جا یا بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ بہتر ہوگا کہ مسلمان علماء اقلیتوں کے نمائندوں کو بلائیں، ان سے ملیں اور اُن کی جائز شکایات و خدشات کے ازالے کی کوشش کریں۔ ہماری چند سماجی عادات ایسی ہیں جو پاکستان اور ہندوستان کے سوا کسی اور معاشرے میں نہیں پائی جاتیں۔ جن کا صدیوں سے ہم خمیازہ بھگت رہے ہیں اور جنھوں نے بہت سی برائیوں کو جنم دیا ہے۔ مثال کے طور پر چھوت چھات کی عادت، جیسا کہ بعض عیسائی دوستوں نے ذکر کیا ہے۔ ماضی میں چند مسلم علماء نے ایسی چھوت چھات کے خلاف بہت کام کیا ہے۔ اب بھی علماء غیر مسلمان مذہبی لیڈروں کے تعاون سے اس غیر انسانی عادت کو جو اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے، مٹانے کی عملی کوشش کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ہم ان روحانی اور اخلاقی اقدار کو فروغ دیں گے جن کے لیے ہر الہامی مذہب کوشاں ہے۔

عیسائیوں کے ان بیانات اور مضامین سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ شاید اسلامی ریاست کے بجائے ایک دنیاوی (Secular) ریاست میں انھیں مذہبی رواداری اور آزادی زیادہ ہوگی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اسلامی ریاست ان معنوں میں مذہبی ریاست نہیں جن معنوں میں مغربی سیاسی فلسفہ میں یہ اصطلاح مستعمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی ریاست نہ تو مغربی طرز کی دنیاوی ریاست ہے نہ سوشلسٹ، لیکن دونوں نظاموں کی اس حد تک مؤید ہے جس حد تک وہ انسانی وقار اور آزادیٔ خیال و رائے کی بحالی اور بقا کے لیے کوشاں ہیں۔ ان اچھے اصولوں کے علاوہ جن کے لیے قرآن، اسلامی ریاست اور ماڈرن جمہوری ریاستیں کوشاں ہیں۔ اسلام کا الہامی پیغام سے بھی تعلق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان پبلک زندگی میں کوئی کردار ادا کر رہے ہیں ان پر اسلام کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات کی پابندی لازم ہے۔ مسلمانوں کا یہ عمل دوسرے مذاہب کے لیے کوئی خطرہ پیش نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس اس کا یہ مطلب ہے کہ مادی خوشحالی، مسرتیں اور لذائذ انسانی سعی اور جد و جہد کا مقصود اور منتہائے نظر نہیں۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ شریعت (معاشرتی ضوابط) کا نفاذ صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کو ریاست سے علیحدہ کرنے سے مغربی دنیاوی حکومتوں نے مذہب کے متعلق ایک منفی رویہ اختیار کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی مفکرین مذہبی جھگڑوں کے خوفناک نتائج سے تنگ آ کر اور

مذہبی آزادی کی خاطر مستقل طور سے دنیاوی ریاست کا تصور پیش کرنے پر مجبور تھے۔ تاہم یہ تصور مذہب سے پیدا شدہ عملی مسائل کو سلجھانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مثال کے طور پر امریکہ کے آئین میں یہ اعلان ہے کہ "کانگریس کوئی ایسا قانون وضع نہیں کرے گی جس سے مذہب کے کسی ایک فرقے کی حمایت ہوتی ہو یا اس کی آزادی پر زد پڑتی ہو۔" علاوہ ازیں، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کسی پبلک یا ٹرسٹ کے عہدے کے لیے کسی مذہبی ٹیسٹ کی ضرورت نہیں ہوگی۔" لیکن عملی زندگی میں یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ ایسے رویے سے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ ایک دفعہ نیویارک سٹیٹ پبلک بورڈ آف ایجوکیشن نیویارک نے سفارش کی کہ ذیل کی دعا سکولوں میں پڑھائی جایا کرے (جو نہ پڑھنا چاہے اس کو ذاتی طور پر مستثنیٰ کر دیا جائے):

"اے خدائے ذوالجلال ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم تیرے محتاج ہیں اور اپنے لیے اپنے والدین، اساتذہ اور ملک کے لیے تجھ سے خیر و برکت کے طالب ہیں۔"

کچھ والدین نے اس دعا کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ یہ ملک کے آئین کی خلاف ورزی ہے آئین کی اس شق سے عام باشندوں کے علاوہ مارمن (Mormons) بھی بری طرح متاثر ہوئے۔ وہ تعدد ازدواج کے قائل ہیں لیکن کانگریس نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہے۔ مارمن نے عدالت سے چارہ جوئی کی کہ یہ قانون مذہبی آزادی کے منافی ہے۔" یہواہ کے شاہد (Jehova's Witnesses) کو بھی کچھ اسی طرح کی مشکلات سے سامنا رہا ہے۔ یہواہ کے شاہد بت پرستی کے خلاف ہیں۔ اس بنا پر وہ امریکہ کے پرچم کو سلام نہیں کرتے وہ جنگ میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ ان کے اس مذہبی رویہ کو حکام نے خلاف قانون سمجھا اور بعد از خرابی بسیار سپریم کورٹ نے ان کے خلاف انتقامی کارروائیوں اور جبر کو ختم کیا۔" ان مثالوں سے یہ عیاں ہو گیا ہوگا کہ مغربی "سیکولرازم" کا مذہب کے متعلق منفی رویہ کس حد تک ناکام یا کامیاب رہا ہے۔ لیکن کسی اسلامی ریاست میں ایسا کوئی مسئلہ کبھی پیش نہیں ہوا۔ مثلاً شراب اور سؤر کا گوشت مسلمانوں کے لیے حرام ہے لیکن غیر مسلموں کے لیے نہیں جن کا مذہب انہیں حلال قرار دیتا ہے۔ انہیں شراب پینے اور سؤر کا گوشت کھانے میں مکمل آزادی ہے۔ شاید اسلامی ریاست واحد ریاست ہے جو اقلیتوں کی سیاسی اور مذہبی آزادی کے علاوہ جوڈیشل آزادی بھی تسلیم کرتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مسلمان فقہاء اور علماء دونوں مذہبی اقلیتوں کو "احرار" یعنی آزاد لوگ قرار دیتے ہیں۔ آخر آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: الاصل فی الناس الحریۃ؛

اسلامی ریاست کو آجکل کے محاورہ میں اس لحاظ سے صحیح "سیکولر" ریاست کہا جا سکتا ہے لیکن مغربی طرز کے

سیکولرازم کے برعکس اسلام کا مذہب کے متعلق رویہ مثبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی مسائل جو بعض اوقات جدید ریاست دوچار ہوتی ہے، اسلامی ریاست میں مفقود ہیں۔

۲۔ سیاسی حقوق

موجودہ نظام ہائے حکومت جدید حالات کی پیداوار ہیں۔ اگر کوئی نظامِ حکومت عامۃ الناس کے مفاد میں ہے تو اسلام اسے تسلیم کرتا ہے۔ اسلام نے کسی خاص قسم کا طرزِ حکومت وضع نہیں کیا کیونکہ بہترین نظام انسانی ذہن کی ترقی کے مطابق اور عمرانی تجربات پر مبنی ہوتا ہے۔ نئے حالات نئے نئے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں اور زندگی مسلسل تغیر پذیر ہے لہٰذا کوئی بھی نظام خواہ وہ کتنا ہی اچھا ہو، اکمل اور خاتم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ امر لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ حالات کے مطابق جس نظام کو بہتر سمجھیں اسے اختیار کر لیں۔ اسلام فقط یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ نظام جیسا بھی ہو عدل پر مبنی ہو۔ قرآن حکیم بار بار حکام کو عدل کی تاکید کرتا ہے۔ بعض مسلم مفکرین کا خیال ہے کہ حکومت کا لادینی اور عادل ہونا کسی دیندار حکومت کی لاقانونیت اور ظلم سے بہتر ہے۔ عدل کے علاوہ مسلم مفکرین اس خیال کے بھی حامی ہیں کہ قوم ہی نظامِ ملک کی صحیح حیثیت حاکمہ ہے۔ اس بات کو کہ مذہبی اقلیتیں قوم کا حصہ ہیں۔ اس اعلان سے تقویت ملتی ہے جو بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خان اور کل ہند کانگرس کے رہنماؤں نے مشترکہ طور پر ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو دہلی سے جاری کیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ: "کانگرس اور مسلم لیگ دونوں عہد کرتی ہیں کہ انتقالِ اقتدار کے بعد وہ اقلیتوں سے جائز اور منصفانہ برتاؤ کریں گی۔ مستقبل کی دونوں حکومتیں ان یقین دہانیوں پر صاد کرتی ہیں۔ وہ اس عزم کا بھی اظہار کرتی ہیں کہ بلا تفریق مذہب، ذات اور جنس، وہ سب شہریوں کے جائز مفادات کی پاسبانی کریں گی۔ اپنے شہری حقوق کی تحصیل میں سب شہری برابر سمجھے جائیں گے"[۱۸]

بعد میں قائدِ اعظم نے پاکستان کا گورنر جنرل بننے کے بعد اس عہد کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا: "آپ کا جو بھی مذہب، ذات اور عقیدہ ہے بنیادی اصول (ریاست) کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم سب ایک ہی مملکت کے شہری اور برابر کے شہری ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں اس چیز کو بطور نصب العین پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہندو بطور ہندو کے اور مسلمان بطور مسلم کے ختم ہو جائیں گے۔ مذہبی اعتبار سے نہیں کیونکہ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ایک ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے"[۱۹]

غالباً جدید زمانے میں یہ اولین تاریخی عہد ہے جو پاکستان کے مسلمانوں نے غیر مسلم ہم وطنوں سے کیا ہے۔ یہ

دستاویز ان معاہدوں کے مماثل ہے جو قرون اولیٰ میں غیر مسلموں سے کیے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے میثاقِ مدینہ کے مطابق جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔
مسلمانوں اور یہودیوں نے عہد کیا تھا کہ :

۱۔ ایک دوسرے سے باہم مشورہ کیا کریں گے۔
۲۔ جنگ کی صورت میں فریقین اخراجات برداشت کریں گے۔
۳۔ بیرونی حملہ کی صورت میں مدینہ کا مشترکہ دفاع کریں گے۔
۴۔ مسلمان اور یہودی ایک ہی قوم کا حصہ ہیں۔ (سیاسی اعتبار سے)
۵۔ دونوں مذہبی امور میں آزاد ہوں گے۔

یہ پہلا معاہدہ تھا جو رسول اکرمؐ نے مدینہ کی شہری ریاست میں یہودیوں سے کیا تھا۔ موجودہ دور میں مسلمان اور غیر مسلموں کے نمائندے صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں باہمی مشاورت سے یہ کام بخیر و خوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔

محولہ بالا حالات کے پیش نظر غیر مسلموں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ صوبائی یا قومی اسمبلیوں میں اپنے نمائندے بھیجیں اور مسلمان اسلام کی رُو سے اپنے عہد کو پورا کرنے کے پابند ہیں۔ لہٰذا سیاسی امور کے میدان میں اقلیتیں اپنا کردار ادا کرنے کی مجاز ہیں۔ جہاں تک مشترکہ یا علیحدہ انتخابات یا اقلیتوں کے لیے اسمبلیوں میں نشستیں مقرر کرنے کا سوال ہے اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق انتظامیہ سے ہے۔ اور حالات کے مطابق یہ مسلہ طے کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اقلیتوں سے منصفانہ اور فیاضانہ برتاؤ کی خاطر اگر قومی اسمبلی میں ان کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں یا سرکاری ملازمتوں میں ان کے لیے کوئی کوٹا " مقرر کر دیا جائے تو یہ اسلام کی سپرٹ کے منافی نہیں۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ اکثریت اور اقلیتوں کے رہنماؤں پر باہمی دنیاوی امور پر بحث و مشورہ لازمی ہے لیکن مذہبی امور پر بحث فریقین کا داخلی اور نجی مسئلہ ہے اور اس بحث میں صرف وہی حصہ لے سکتے ہیں جن کا اس سے براہ راست تعلق ہے۔

اس معاملہ پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ بہر حال مزید وضاحت کے طور پر اس کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسے معاشرے کے قیام کا خواہاں ہے جو حق و انصاف پر مبنی اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا حامل ہو۔ اس معاشرے کا اولین تقاضا یہ ہے کہ خدا اور بندے کے مابین رشتہ کو پھر سے استوار کیا جائے۔ مغرب کے بعض مفکرین کے اس مشاہدے میں کافی صداقت معلوم ہوتی ہے کہ مغربی سیکولرازم اپنی شاندار تہذیب و تمدن کے باوجود

اب مشرقی اقوام کے لیے جگہ خالی کر رہی ہے۔ ہمیں ایسے انقلاب کے لیے کوشاں ہونا چاہیے جو ہماری تہذیب و تمدن اور تابندہ و صحت مند روایات سے ہم آہنگ ہو۔ اس نظام میں عقل اور وحی ہم آہنگ و ہم قدم ہوں۔ خیال رہے کہ محض وحی یا محض عقلِ انسانی مسائل پر قابو حاصل نہیں کر سکتی۔ دونوں خدائے عزوجل کا احسان اور تحفہ ہیں اور دونوں مل کر انسانی عشرت اور آسودگی کے حصول کے لیے ایک ترقی پذیر اور روحانی معاشرے کے قیام میں صرف ہونا چاہیے۔ ایسا معاشرہ جو استحصال، نفرت، نفاق، افتراق اور بدنظمی سے پاک ہو۔ ہمیں چاہیے کہ انسانیت کی بہبود اور خدا کی تسبیح و تعظیم کے لیے اور اس کے احکام کے فروغ کی خاطر متحد ہو کر اس معاشرے کے قیام کے لیے کوشش کریں۔

مآخذ

۱۔ القرآن ۴۵ : ۳

۲۔ القرآن ۱۵ : ۲۹

۳۔ مشکوٰۃ المصابیح (باب الحب فی اللہ بروایت البیہقی)

۴۔ بوستان (سعدی) باب احسان صفحہ ۲۶۰)

۵۔ Sir William Muir.- "The Caliphate; Rise, Decline and Fall"
Edinburgh, 1924 P. 602

۶۔ القرآن ۲ : ۱۹۰ - ۱۹۳

۷۔ ابن تیمیہ رسالۃ القتال۔

۸۔ القرآن ۹۰ : ۸

۹ القرآن ۵ : ۲

۱۰ القرآن ۲۲ : ۴

۱۱ سیرت ابن اسحاق آکسفورڈ [illegible] صفحہ [illegible]

۱۲ ڈاکٹر حمیداللہ [illegible]
رسالۃ المباحث العلمیہ، حیدرآباد دکن [illegible] لندن [illegible] ۱۹۶۴ء)

۱۳۔ الوثائق السیاسیہ (رخ [illegible]) [illegible] فتوح البلدان قاہرہ ۱۹۰۱

۱۳- الوثائق السیاسیہ۔ علاوہ ازیں A. L. Tibawi کے مضامین جو اسلامک کوارٹرلی لندن اپریل ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک اچھا منتظم مفاد عامہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے۔

۱۴- T. W. Arnold : "The Preaching of Islam" Lahore P. 63. اپنی کتاب Islamic Law (لندن ۱۹۶۱) میں ڈاکٹر سعید رمضان نے بھی اس معاملہ پر بحث کی ہے۔ علاوہ بریں شبلی نعمانی کی کتاب رسالہ الجزیہ بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جزیہ فارسی کا لفظ ہے جو اسلام سے پہلے عربی زبان میں مستعمل تھا۔ یہ کوئی اسلامی اصطلاح نہیں کہ جس سے غیر مسلموں کو مسلمانوں سے الگ کرنا مقصود ہو۔

۱۵- Outlook, Karachi, November 4, 1974.

۱۶- R. L. Carr : American Democracy in Theory and Practice U.S.A. 1966, p. 440-42.

۱۷- L. Mosley : "The last days of British Raj." London 1961. p. 298

۱۸- Hector Bolitho : "Jinnah" Oxford 1966 p. 197

۱۹- یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا مسلمانوں کو غیر مسلموں سے مل کر حکومت بنانے کی اجازت ہے۔

(ب) کیا غیر مسلم کو ایک مسلم مملکت میں صدر حکومت چنا جا سکتا ہے۔

(ج) کیا کسی تقریب کے آغاز میں قرآن مجید کے علاوہ غیر مسلموں کی مذہبی کتب سے تلاوت جائز ہے۔ میں نے ان سوالات پر ایک علیحدہ مضمون بعنوان "پاکستان میں دستوری بحران اور علماء" میں بحث کی ہے، اسے آئندہ کسی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔